سہ ماہی
آئندہ
کراچی
مدیر
محمود واجد

جلد:۹ شمارہ: ۳۶-۳۵
اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۴ء

سہ ماہی

کراچی

مدیر: محمود واجد

رابطہ: ہاشمی ٹریڈنگ، اودھوداس روڈ، عقب الیکٹرک مارکیٹ، آرام باغ، کراچی۔۷۴۲۰۰ (پاکستان)

ای۔میل: aaindahkarachi@yahoo.com
فیکس: 092-21-2214040
فون: 2626516, 2624040
موبائل: 0300-2244866

جلد:۹ شمارہ: ۳۶-۳۵

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۴ء

سہ ماہی

کراچی

مدیر: محمود واجد

معاون مدیر (اعزازی): سائرہ غلام نبی

مدیر انتظامی: ممتاز ہاشمی

کیلی گرافی: صابر حسین

آرٹ ورک: آصف جمیل

طابع: محمد علی

احمد برادرز، 16-11/B

ناظم آباد، کراچی

ناشر: واجد ہاشمی

D-106, Asma Garden,
Off: A.H.Isphahani Road,
Opp: Journalist Society,
Karachi-75330
Pakistan
Ph: 8140468

فی شمارہ: ۵۰روپے صفحات: ۱۶۰

سالانہ قیمت: ۲۰۰روپے (چار شمارے)

بیرون ملک:

بھارت/ بنگلہ دیش: (علاوہ ڈاک خرچ) ۲۲۰روپے

سعودی عرب: (بشمول ڈاک خرچ) ۱۰۰ریال

متحدہ عرب امارات: (بشمول ڈاک خرچ) ۱۰۰درہم

یورپی ممالک: (بشمول ڈاک خرچ) ۱۵ پونڈ

امریکہ/ کناڈا: (بشمول ڈاک خرچ) ۲۵امریکی ڈالر

دیگر ممالک: مساوی ۲۵امریکی ڈالر

قیمت خصوصی شمارہ: ۱۲۰ روپے صفحات: ۳۲۰

دفتر: ہاشمی ٹریڈنگ، اودھوداس روڈ، عقب الیکٹرک مارکیٹ، آرام باغ، کراچی۔۷۴۲۰۰

تفصیل

تحریریں	صفحہ	قلم کار
اظہار		
ہم کہاں نہیں ہوتے؟	۷	ادارہ
عقیدت		
حمد	۹	رفیع الدین راز، یعقوب تصور
حمد	۱۰	ظفرالحق چشتی، فرحت آراء
نعت	۱۱	راہی فدائی
نعت	۱۲	آذر حفیظ، حسن نظامی
ترسیل		
فکشن کی تنقید کے بعض رویے	۱۳	حنیف فوق
مکالمہ اپنے عہد سے	۲۵	جوگندر پال
قاضی عبدالودود اور افسانوی ادب	۳۶	مظہر امام
فکشن کی شعریات کا پہلا مرتب: عبالقادر سروری	۴۲	ابوبکر عباد
عصری ناول نگاری	۵۲	رضی مجتبیٰ
''گینڈا'' یا ''آخری آدمی''	۵۸	ناصر بغدادی
اسد محمد خاں-ایک غیر معمولی افسانہ نگار	۶۶	انوار احمد
جدید اور مابعد جدید فکشن: ایک مثال	۷۱	فہیم اعظمی
منٹو شناسی: ایک تقابلی مطالعہ	۷۶	اے۔ خیام
جدید اردو ناول: چند سرسری تاثرات	۸۳	مبین مرزا
دہشت کے موسم میں کہانی کا چلن	۱۰۴	محمد حمید شاہد
ناول کی تفہیم و تعبیر کی دشواریاں	۱۱۰	ممتاز احمد خاں
۱۹۹۰ کے بعد کا اردو فکشن: ہندوستان میں	۱۱۵	مشرف عالم ذوقی
معروف اردو ناولوں کے بعض کرداروں میں زندگی	۱۲۸	سائرہ غلام نبی
فکشن میں روح کی بازیافت: ابتدائیہ	۱۳۷	محمود واجد
نظمیں		
اے خدا اے خدا	۱۴۴	حسن عابدی
درخت بوزنے اور آدمی	۱۴۵	ادیب سہیل
سیاہ خانہ/کولاژ	۱۴۶	وحید الحسن

مشرف عالم ذوقی

۱۹۹۰ کے بعد کا اردو فکشن: ہندوستان میں

کہاں ہے فکشن کی نئی نسل؟

بات اداس کردینے والی ہے لیکن حقیقت پر مبنی ہے۔ ہندوستان میں اردو فکشن کا زوال آچکا ہے۔ جو افسانہ نگار قد آور بنا کر اردو کے نقادوں کے ذریعے پیش کئے گئے۔ وہ اتنے پستہ قد ہیں کہ ان کے ادب پر بات کرنا تضیع اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اردو فکشن کو زوال کے نزدیک پہنچانے کا سہرا، ایسے ادیب اور مدیر حضرات کے سر بھی جاتا ہے جن کے بارے میں یہ رائے عام ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں ۲۰ گھنٹے وہ صرف پڑھنے اور لکھنے میں گزارا کرتے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ آپ تیس مار خاں کیوں نہ ہوں، لیکن آپ فکشن کے معیار کا کوئی 'ذاتی پیمانہ' ایجاد نہیں کر سکتے ...... ہمارے یہاں اس 'ذاتی پیمانے' نے پہلے لکھنے والوں کی غیرت خریدی، پھر اردو فکشن کو ہی سر بازار ننگا کر دیا۔ المیہ یہ بھی ہے کہ ۲۰۰۰ کے بعد اردو میں نئی نسل کا دور دور تک پتہ نہیں ہے اور نئے لکھنے والے ہندی اور دوسری صوبائی یا علاقائی زبانوں کی طرف رجوع کر چکے ہیں۔

حاشیہ پر اردو کی نئی نسل

پاکستان میں رہنے والوں کو میری اس بات پر حیرت ہو سکتی ہے لیکن نئی نسل کا گم ہو جانا ہندوستان میں اردو زبان کے لئے اب ایک بھیانک سچ بن چکا ہے۔ بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی ...... ایک بانسری والا ہے جو بانسری بجاتا ہوا، گاؤں کے سارے چوہوں کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ بانسری والا دوبارہ آتا ہے۔ بانسری بجاتا ہے۔ اس بار اس کے پیچھے پیچھے چھوٹے چھوٹے بچوں کی فوج ہوتی ہے۔ وہ ان بچوں کے ساتھ پہاڑی کے عقب میں اُتر کر غائب ہو جاتا ہے۔

اس قصے کو اردو کے ساتھ جوڑیئے تو بانسری والا پہلے اردو زبان کو لے گیا اور اس کے بعد نئی نسل کو۔ تقسیم کے ناسور نے اردو کو بھی اس کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ شیریں زباں اردو روزی روٹی، روزگار سے اپنا رشتہ منقطع کر کے حاشیہ پر

پھینک دی گئی۔ اردو روز بروز اپنوں سے دور ہوتی چلی گئی۔ آزادی کے ۷۵ برسوں میں یہ زبان ہندوستان میں صرف اپنا مرثیہ لکھنے کے لئے زندہ رہ گئی تھی، یا دوسرے لفظوں میں اردو شاعری، یا پھر کسی حد تک فلموں کی زبان بن گئی تھی۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے فلمی زبان کا چلن بھی بدلا۔ پہلے ہندوستانی زبان اور اب کانٹے، کمپنی، سے منا بھائی ایم بی بی ایس تک ایک ٹھیٹ دیسی زبان۔ اور ایسی نازک صورت حال میں اردو اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے جد و جہد کرتی رہی اور اس مسلسل جد و جہد کے نتیجے میں یہ آج بھی زندہ ہے تو یہ کم بڑی سچائی نہیں ہے۔

لیکن کیا اتنا کافی ہے کہ ایک بڑی زبان نے کس طرح سسکتے سسکتے اپنے آپ کو زندہ رکھا ہے۔ ایک تلخ سچائی یہ ہے کہ ۱۹۹۰ء کے بعد اردو میں نئی نسل کے آنے کی رفتار رک گئی ہے۔ فکشن کے نئے دستخط ادب میں ناپید ہیں۔ پرانے دستخط اور کم و بیش جنہیں آج بھی نوجوان قلم کار کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے، ان میں سے زیادہ تر لوگ پچاس نہیں بلکہ ساٹھ سے زیادہ عمر گزار چکے ہیں۔ تادم تحریر میں خود بھی عمر کی بیالیس بہار اور بیالیس خزاؤں کا حساب لے چکا ہوں اور آپ جانئے کہ منٹو تو اس عمر میں اپنے شاہکار چھوڑ کر رخصتی کا پروانہ بھی لے کر آ گیا تھا۔ اردو ادب میں اس سے زیادہ تاریکی کا، اس سے قبل کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ یعنی بھیانک اندھیرا ہے۔ اجودھیا اور گجرات سے بھی بھیانک۔ کیونکہ آپ تسلیم کیجئے نہ کیجئے، میں ایک زبان، ایک تہذیب کو کسی پاشان، کسی موئن جوداڑو میں گم ہوتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

''وہ گم ہو جائیں گے

جیسے ایک دن

تہذیبیں گم ہو جاتی ہیں''

پہلی بجلی تہذیب پر گری۔ کہتے ہیں پہلے آئیڈیالوجی پر برف جمتی ہے اور اس کے بعد زبان خود بخود گمنامی کے اندھیرے میں کھو جاتی ہے۔ آئیڈیالوجی اور فکر کی سطح پر، آزادی کے ۷۵ برسوں کی حقیقت بھیانک تھی۔ سچائی یہ تھی کہ آپ کہاں تک جد و جہد کریں گے۔ جد و جہد کے کٹہرے میں مسلمان تھے۔ ۷۵ برسوں میں لگاتار اپنی زمین اپنی خاک اور اپنے ہندوستان کے لئے مسلسل تکلیف دہ سوالوں سے جوجھتا ہوا مسلمان۔ کرکٹ سے پاکستان، وفاداری سے غداری تک۔ نسلیں جنم لیتی رہیں اور مسلمان بار بار زہریلے تیروں سے زخمی ہوتا رہا۔

...... کپل دیو اور عمران میں زیادہ کون پسند ہے؟

...... آتش بازیوں کے چھوٹنے اور پاکستان کے فتح کے درمیان کیا تعلق ہے؟

...... ثابت کرو کہ تم اس ملک کے لئے وفادار ہو۔

دیکھا جائے تو آچاریہ گری راج کشور سے لے کر پروین توگڑیا، سنگھل اور بال ٹھاکرے تک کی عدالت میں مسلمانوں کے لئے اپنی وفاداری کو ثابت کرنے کے لئے کچھ یہی سوالات ہوا کرتے تھے۔ اسکول سے کالج، دفتر سے گھر اور دوستوں سے باہر کافی ہاؤس تک ایک پوری زندگی ان ہی مکالموں کے درمیان گزر جاتی تھی اور یہ بات کم و بیش

بھلا دی جاتی کہ تقسیم کے وقت نفرت کے اندھڑ میں جو اپنی خاک، اپنا وطن چھوڑ کر نہیں گئے، وہ کتنے بڑے وطن پرست تھے۔

ممکن ہے اردو فکشن پر تنقید سے الگ یہ گفتگو آپ کو کوئی سیاسی گفتگو لگ رہی ہو۔ تسلیم! لیکن جانے انجانے اردو اس سیاست کا حصہ بن چکی ہے۔ تسلیم کہ کانگریس کی حکومت میں مسلمان محفوظ ہیں مگر یہ بھی دیکھئے کہ کرناٹک کی حکومت پوری قوم کو اقلیت سے شیڈولڈ کاسٹ میں تبدیل کر کے ریزرویشن دینا چاہتی ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ کانگریس کے بعد......؟ کی فکر سے اس ملک کا مسلمان باہر نکل ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اگر فرقہ پرست پارٹی دوبارہ برسر اقتدار آتی ہے تو مسلمانوں کے ساتھ اردو کا نام لیوا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ اس لئے اردو پر مکالمہ ہوگا تو سیاست کی باتیں سامنے آئیں گی ہی۔

حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے ۷۵ برسوں میں مسلمان مسلسل اپنی شناخت کے لئے لڑتا رہا۔ تقسیم، فرقہ وارانہ فساد اور گجرات سے پیدا شدہ سچ، اسی شناخت کی شاخیں تھیں۔ عرصہ پہلے 'شفق' نے اسی موضوع کو لے کر ایک کہانی لکھی تھی...... شناخت۔ یہ آزادی کے بعد ابھرے ہولناک سچ سے پیدا ہونے والی کہانی تھی۔

آزادی کے بعد کا ہندوستان، فساد اور دنگوں کی نئی نئی کہانیاں رقم کر رہا تھا۔ اردو افسانہ نگار خوفزدہ تھا۔ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسندی کو، اظہار میں دقت پیش آرہی تھی۔ زمین گرم اور بارودی ہو چکی تھی۔ 'انگارے' کا عہد ختم ہو چکا تھا۔ ڈرے سہمے تخلیق کار نے لکھنا چاہا تو جدیدیت کے علاوہ کوئی روشنائی میسر نہ تھی۔ آپ مانیں نہ مانیں، نقاد تسلیم کریں نہ کریں لیکن جدیدیت کی پیدائش اسی پُر آشوب موسم میں ہوئی تھی۔ خوف کی سرزمین، وحشت کے سائے، دہشت کا پس منظر: کل ملا کر مجموعی فضا ایسی تھی کہ تحریر پر نئے اور جدید الفاظ حاوی ہوتے چلے گئے۔ ڈرے سہمے لوگ انگارے کی ترقی پسندی اور بے باکی چھوڑ، نئے الفاظ سے تاش کا نیا محل (کہانی) تعمیر کرنے میں جٹ گئے تھے۔ یعنی جدیدیت ایک ایسے خوفناک اندھیرے سے برآمد ہوئی، جہاں ڈر تھا کہ لفظوں کو زبان مل گئی تو اپنی آزادی کے لئے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ نئے ماحول میں مسلمان ہونے کے معنی بھی بدلے تھے۔ نئے ماحول میں سیکولرازم اور لبرل ازم کی ہوا اس شدت سے چلی کہ پتہ بھی نہیں چلا۔ تب تک نئی آزادی میں پرورش پانے والی نئی تہذیب کے بطن سے خوفزدہ علامتیں جنم لے چکی تھیں۔

جدیدیت اور لکھنے والوں کی بھیڑ

دیکھا جائے تو یہ اردو کا سنہری عہد تھا۔ اردو تحریر میں 'مسائل' کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ لکھنے والوں کا ایک لمبا قافلہ تھا۔ لکھنے والوں پر یعنی جدیدیوں پر سب سے بڑا الزام یہ بھی لگایا گیا کہ قاری گم ہو گیا۔ لیکن اردو قاری کے گم ہونے کے باوجود لکھنے والوں کی قطار میں مسلسل اضافہ ہوا جا رہا تھا۔ اس عہد نے کئی بڑے نام دیئے۔

۱۹۸۰ کے بعد بیانیہ کی واپسی کا ڈھول زور زور سے پیٹا گیا۔ ایک بار پھر ملک کے حالات بدل چکے تھے۔

اڈوانی جی کی رتھ یاتراؤں نے پورے ملک کو بارودی سرنگ میں تبدیل کر دیا تھا۔ادب تو سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔بدلے ہوئے فسادزدہ موسم کا تقاضا تھا کہ جدیدیت کے خول سے باہر نکلا جائے اور ایک بار پھر ترقی پسند لفظوں پر بھروسہ کیا جائے۔۸۰ کے بعد کا ادب اسی نفرت کی آندھی سے وجود میں آیا تھا۔ پاکستان، ہجرت اور فرقہ وارانہ فساد اور ان سے مسلسل پستے ہوئے مسلمانوں پر عبدالصمد کا ناول ''دوگز زمین''، ''خوابوں کا سویرا'، ذوقی کا ''بیان''، ''مسلمان''، حسین الحق کا ''فرات'' سامنے آ چکے تھے۔۱۹۹۰ اور ۹۵ تک ان موضوعات پر اور بھی کئی کچی پکی تحریریں سامنے آئیں لیکن ایک حقیقت اور بھی تھی یہ تمام لکھنے والے وہی تھے جو ایک لمبے عرصے سے ادب لکھنے میں مصروف تھے۔لیکن سوال تھا کہ نئی نسل کہاں ہے؟ کیونکہ اس وقت تک مرحوم انور خاں، سلام بن رزاق، علی امام نقوی، شوکت حیات، شفق جیسے تمام افسانہ نگاروں کو نوجوان افسانہ نگار کے نام سے ہی یاد کیا جارہا تھا۔

اس سچ کا انکشاف بھیانک تھا کہ نئی نسل کا آنا رک گیا ہے۔اردو کے ارد گرد خوش فہمیوں کا حصار کھینچنے والے اور اردو کے نام پر اپنی اپنی روٹیاں سینکنے والے اس سچ سے قطعی انجان تھے۔یعنی مشرف عالم ذوقی کے بعد؟ شاہد اختر کے بعد؟ معین الدین جینابڑے اور سہیل وحید کے بعد؟ صغیر رحمانی اور شمین حیات کے بعد؟

لکھنے والے اپنے عہد کے مسائل اور فرقہ وارانہ فساد سے بھی متاثر تھے۔ پرانی الفی کے ختم ہوتے ہوتے مسلمان دہشت اور آتنک واد کا استعارہ بن چکا تھا۔نئی نسل ہندوستان میں اپنا ملک، اپنی زمین تلاش کر رہی تھی کیونکہ ۲۰۰۰ کے بعد کی ہندوستانی سرزمین، ترشول اور ہندوتو کی سرزمین تھی۔سیاسی سرگرمیوں کا طوفان آیا ہوا تھا۔سہیل حید نے اس موضوع پر ایک کہانی لکھی اور مضبوطی سے اپنی موجودگی کا فخریہ اعلان کر ڈالا۔

''محمد بن قاسم ہزاروں شہسواروں کے ساتھ وادیٔ سندھ کو سر کرتا چلا آرہا ہے۔چاروں طرف قتل وغارت گری ہے۔ چیخ و پکار ہے اور وہ سب کو روندتا ہوا بڑھتا چلا آرہا ہے۔اس نے آتے ہی اپنی شہنشاہیت کا اعلان کر دیا۔اس کے کارندے ملک بھر کے راجاؤں اور جاگیرداروں کو جمع کر رہے ہیں۔محمد بن قاسم ان سب جاگیرداروں اور راجاؤں سے ان کے صوبے کی مناسبت سے رقم وصول کر رہا ہے۔ جتنا بڑا صوبہ ہے اتنی بڑی رقم شاہی خزانے کے حوالے کر دو ورنہ صوبہ تم سے لے لیا جائے گا۔کچھ دے رہے ہیں، کچھ دبی زبان میں احتجاج کر رہے ہیں۔دیکھتے ہی دیکھتے سونے چاندی کے سکوں اور زیورات کا انبار لگ گیا۔محمد بن قاسم فاتحانہ نظروں سے سونے چاندی کے ڈھیروں کو دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے.....

''بس ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں بچی.....''

''نہیں حضور سارے علاقوں کا نذرانہ آپ کو ادا کیا جا چکا ہے۔''

''بس اتنی ہی زمین ہے ہندوستان میں.....؟''

''ارے یہ کیا، یہ تو یہاں جاتے ہیں خرید وفروخت شروع کر دیتے ہیں.... لڑکی کی قیمت.....مہر.....'' میں

پوری قوت سے چیخا۔

''نہیں قاسم نہیں...... یہ زمین نہیں بک سکتی۔''

(''زمین'' ۔ سہیل وحید)

یہ آزادی کے بعد کا المیہ تھا۔ ایک طرف زمین کھسک رہی تھی۔ دوسری جانب پاکستانی ٹھہرائے جانے کا الزام تھا۔ اپنا وطن، اپنی مٹی، سب پرائی نظر آ رہی تھی۔

''جلوس اس کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا......

''ہندوستان چھوڑو...... پاکستان جاؤ۔''

''بھارت چھوڑو۔''

وہ سوچنے لگا، گھر میں تو بیٹی داماد ہیں۔ محلے والے مسجد میں نہیں رہنے دیں گے۔ اب اسے اپنے وطن کی فصیل بھی تنگ جان پڑنے لگی تھی۔

''تو کہاں جائیں وہ......''

''کیا پاکستان......؟''

''مگر کیوں؟''

''وہاں کون ہے اس کا......؟''

(''اُسے زمین پر رہنے دو''۔ صغیر رحمانی)

دیکھتے ہی دیکھتے صورت حال مکمل طور پر بدل گئی۔ ''رتھ یاترا پارٹی'' ایک خوفناک مذہب کا لبادہ اوڑھ کر آئی تھی۔ اردو میں لکھنے والا مسلمان ادیب ذاتی انتشار اور بے چینی سے الگ اپنی شناخت اور حب الوطنی کے جذبے میں غوطہ زن تھا۔ اپنا ملک جیسے گھنے کہرے میں گم ہو گیا تھا۔ مودی، توگڑیا جیسے لوگوں پر کوئی پونا نہیں تھا۔ اسلامی دہشت پسندی کا شور زوروں پر تھا۔ لکھنے والا اسی سیاسی منظر نامہ میں مسلمانوں کی نفسیات کا مطالعہ کرتا ہوا اپنی تحریر کو دھاردار اور با معنی بنانے میں مصروف تھا۔

دراصل مسلمانوں کو کمزور کرنے والی نفسیاتی کنجی شروع ہی سے بھاجپا کے پاس رہی تھی اور شری اڈوانی بحیثیت نفسیاتی معالج، اس کنجی کا شروع سے ہی سیاسی اور سماجی استعمال کرتے آئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ شری اڈوانی نے سگمنڈ فرائیڈ کو پڑھا ہے یا نہیں یا جارج آرویل کی مشہور تصنیف 1984 کا مطالعہ انھوں نے کیا ہے یا نہیں۔ لیکن رتھ یاتراؤں سے مودی کی پیٹھ تھپتھپانے تک وہ فرائیڈ کو مکمل طور پر شکست دے چکے تھے۔ جارج آرول کے ناول میں ایک پُراسرار دنیا میں، ایک جملہ بار بار آپ کو دہشت میں مبتلا کرتا ہے۔

'Big brother is watcing you'

دیکھا جائے تو یہی جملہ بھاجپا کے قائد مسلمان کے لئے بار بار دوہراتے نظر آئے۔

"دیکھو! بھاجپا تمہیں دیکھ رہی ہے۔"

"مسلمانو! بھاجپا کی نظر سے تم کتنی دور جا سکتے ہو؟"

رتھ یاتراؤں سے لے کر ۲۰۰۳ تک مسلمانوں کے لئے "ایک دھکا اور دو۔ بابری مسجد توڑ دو" والا سلسلہ مسلسل بنا ہوا ہے۔ شاید ہی دنیا کی کسی دوسری زبان کو نفسیات سے روز بروز لہولہان ہوتی رہی۔ کبھی ادیب کمزور پڑا، کبھی قلم اور اسی کے ساتھ اردو میں نئی نسل کا آنا بند ہو گیا۔ زیب اختر، شین حیات، صغیر رحمانی، غزال ضیغم، دیکھتے ہی دیکھتے لکھنے والوں کا ایک مختصر سا کارواں ہندی کی طرف ہجرت کر گیا۔ یہ لکھنے کی مجبوری سے زیادہ اپنی بات زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی مجبوری بھی تھی۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم اب بھی خوش فہمیوں کے جنگل میں جی رہے ہیں کہ زبان مری نہیں ہے۔ لیکن سوال ہے زبان ہے کہاں؟ اردو محض چند اخبار اور دو چند اردو رسائل کے سہارے زندہ ہے۔ اس زبان میں لکھنے والا کسی روزگار کی امید نہیں کر سکتا۔ اپنے لفظوں کی قیمت نہیں وصول کر سکتا۔ لیکن ایک حقیقت اور بھی ہے۔ گہری ناامیدی نہ ختم ہونے والی تاریکی کے باوجود، ہم نے امید اور حوصلے کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ ہم جیسے کسی معجزے کے انتظار میں ہیں۔ روزی روٹی سے کاٹ دیئے جانے کے باوجود آزادی کے ۵۷ برسوں میں کسی بھی طرح ایک زبان زندہ رہی تو ہم بھاجپائیوں کے ہاتھوں اس زبان کو مرنے نہیں دیں گے۔ ہماری امیدیں اکادمیوں سے نہیں ہیں۔ ہماری امید کا مرکز ہے عام آدمی۔ جو کسی بھی مذہب کا ہو سکتا ہے۔ لیکن اردو کے ذکر کے ساتھ جس کے ہونٹوں پر اداس مسکراہٹ کے ساتھ صرف ایک جملہ ہوتا ہے...... "شیریں زبان۔ اس زبان کو مرنا نہیں چاہئے۔" دوسری اہم بات اردو کو ہندی جیسی راشٹریہ زبان اور ہندی کے تمام لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہے۔ وہ لوگ ہماری زبان کے لئے مسلسل اپنی طرف سے کوئی نہ کوئی جنگ لڑتے رہتے ہیں۔

کہانیاں، جو ڈر گئی تھیں

اب ذرا اردو کی سیاسی صورت حال سے باہر نکل کر کہانی کی طرف واپس آتے ہیں۔ ۱۹۹۰ سے ۲۰۰۳ کا سفر، اردو کہانی کے لئے ایک 'تاریخی سفر' کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی ملک کی صورت حال کے بد سے بدتر ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کہانی بھی ڈری اور سہمی نظر آنے لگی تھی۔

اردو کبھی بھی تقسیم کی ذمہ دار نہیں رہی۔ اس کے باوجود آزادی کے بعد اردو پر فرقہ واریت کا الزام بھی لگا اور

اردو کو تقسیم کی ذمہ دار آنکھوں سے بھی دیکھا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شیریں زبان اردو روزی روٹی سے کاٹ کر حاشیے پر دھکیل دی گئی۔ ۵۷ برسوں کے سیاسی منظر نامے میں یہ زبان ایک ڈری سہمی ہوئی زبان بن گئی۔ رتھ یاتراؤں، بابری مسجد شہادت سے لے کر گجرات قتل عام سے پیدا شدہ بھیانک صورت حال کا جائزہ لیجئے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوگا کہ اردو اس لئے ڈری چونکہ مسلمان ڈر گئے تھے۔ دیکھا جائے تو اس نقطۂ نظر سے زبان فرقہ واریت کے کٹہرے میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ بات غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ زبان کسی مذہب یا قوم کی جاگیر نہیں ہوتی۔ ۵۷ برسوں میں اردو کی اس حالت زار کو لے کر 'چامسکی' کی زبان کے بارے میں تمام فلسفے مثلِ حباب ثابت ہوتے ہیں۔ رتن سنگھ اور جوگندر پال جیسے سینئر افسانہ نگاروں کا تذکرہ چھوڑ یئے تو زیادہ تر مسلمان افسانہ نگاروں کے افسانے کے 'مسلمان' کردار اس قدر خوفزدہ دکھائی دے رہے تھے کہ نئی کہانی کو لے کر از سرِ نو گفتگو کی ضرورت محسوس ہوئی۔

آپ کو تعجب ہوگا، تقسیم کے وقت اردو تو بالکل نہیں ڈری تھی۔ فساد کے درمیان یہ کماری 'سادھوی' یا او ما بھارتی کی طرح 'علم الحساب' میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ بقول کرشن چندر، پشاور ایکسپریس یا اس وقت کی زیادہ تر کہانیوں کا جائزہ لیجئے ...... 'ہندوؤں نے اتنا مارا۔ مسلمانوں نے اتنا مارا...... ' اتنے مسلمانوں سے کٹی ہوئی ریل امرتسر اسٹیشن پر رکی تو دوسری جگہ یہی باتیں ہندوؤں کے بارے میں لکھی جا رہی تھیں۔

ایک دوسرے کو موردالزام ٹھہرانے والی کہانیاں بھی تھیں۔ یعنی ایک پر دوسرے پر کٹر پن کا الزام لگانا۔ زخمی حالات یا مسائل سے آنکھیں بند کر لینے کی کارروائی...... بربریت اور ہر طرح کے ظلم کی عکاسی کے باوجود اس وقت کی کہانیاں خوفزدہ نہیں تھیں۔

اردو افسانہ نگاروں کی کہانیوں نے ڈرنا شروع کیا ہے، اڈوانی جی کی رتھ یاتراؤں کے وقت سے...... یعنی پندرہ برسوں کا عرصہ اردو افسانہ نگاروں کے لئے ایسا بدترین عرصہ رہا ہے جس کی نظیر ساری دنیا میں نہیں ملے گی۔

افسانہ نگار تو ڈرا تھا ہی، ساتھ ہی اردو افسانہ نگاروں کی کہانیاں بھی خوفزدہ ہو گئی تھیں۔

ساجد کی 'پناہ'، سلام کی 'اندیشہ'، اشرف کی 'آدمی'، شوکت حیات کی 'گنبد کے کبوتر'، ولی محمد چودھری کی 'دھند میں گھرا مکان'، علی امام نقوی کی 'ڈونگر باڑی کے گدھ'، خالد جاوید کی 'کوبڑا اور ہذیان'، طارق چھتاری کی 'باغ کا دروازہ' میں شامل زیادہ تر کہانیاں احمد رشید کی 'وہ اور پرندہ' اسی طرح انجم عثمانی، ابن کنول، ام مبین، نورالحسنین، مظہر سلیم، اشیاق سعید وغیرہ بھی ڈری سہمی کہانیوں کی 'جگالی' کر رہے تھے۔

کہانی کا خوفزدہ ہو جانا کسی بھی زبان کی تاریخ میں شاید پہلی بار ہوا تھا۔ اردو جس کا ایک شاندار ماضی رہا تھا۔ چلیے ایک نظر 'داستانی عہد' پر بھی ڈالتے ہیں۔

اردو اپنے داستانی عہد سے ہی (۱۸۶۵ سے ۱۹۰۰) حال اور تاریخ دونوں ہی سے ایک ساتھ روبرو ہوتی رہی۔ خواجہ ناصر، فراق دہلوی کا زمانہ یاد کیجئے۔ 'لال قلعہ کی جھلک'، 'بیگموں کی چھیڑ چھاڑ' یا 'دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ' ہو۔ ان

داستانوں کی زبان اور تاریخ کے چھینٹے تو دیکھئے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت، سلطنت اودھ کی مغلیہ فوج کی کہانیاں ''گھنہ بیگ' کے نام سے لکھ رہے تھے اور' دربار دہلی کی کنکوا بازی' کے قصے سنا رہے تھے۔ میر باقر علی داستان گو سے اردو کی شروعاتی کہانیوں تک اپنے عہد اور حالات کی عکاسی ہوتی رہی۔ ان کہانیوں میں کہیں کہیں ۱۸۵۷ء کے غدر کا ذکر بھی مل جاتا ہے۔

یہ تذکرے یوں ضروری تھے کہ اردو کہانیوں نے سامنے کے حالات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا۔ انگریزوں کے ظلم بڑھے، نفرت کی آندھیاں چلیں اور تقسیم کے سیاہ بادل لہرائے تو قلم کی نوک ذرا دھاردار ہوگئی۔ عزیز احمد، قدرت اللہ شہاب، پریم ناتھ در، اُپندر ناتھ اشک، راما نند ساگر، منٹو، احمد علی، عصمت چغتائی، اشفاق احمد، دیکھا جائے تو سارے ہی لہولہان تھے۔ تقسیم کی ہیبت ناکی، موت کی آندھی بن کر آئی تھی۔ سب سے بڑی بات 'قلم' ترقی پسند تھا۔ لکھنے والے، اپنے لکھنے پر محتاط تھے......

'خبردار تحریر پر اثر نہیں پڑے'

شاید اسی لئے عزیز احمد کی 'کالی رات' ہو یا اشک کی 'ٹیبل لینڈ'، شہاب کی 'یا خدا' ہو یا راما نند ساگر کی 'بھاگ ان بردہ فروشوں سے'، عصمت کی 'جڑیں' ہو یا منٹو کی 'کالی کہانیاں' سب کے موسم ایک تھے۔ سب کا درد ایک تھا۔ سب کی کہانیوں میں ہندو اور مسلمان ہلاک ہو رہے تھے۔ لیکن سبھی کو راستے کی تلاش تھی۔ نفرتیں بھیانک نہیں ہوئی تھیں۔ کہانی خوفزدہ یا سہمی ہوئی نہیں تھی۔

فساد اس ملک کا چوتھا موسم رہا ہے۔ آزادی کے بعد بھی فساد ہوتا رہا۔ فرقہ وارانہ فساد، شیعہ سنی فساد......اردو قلم ایسے تمام حادثوں سے گزرتا رہا۔ ظاہر تھا اپنے مسائل سے آنکھیں بند کر کے لکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

بابری مسجد شہادت کے ارد گرد حالت ذرا زہریلی ہوئی۔ حالات سازگار نہیں تھے۔ (یہ سب خود میری آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے) بسوں میں اردو رسائل کو نفرت سے دیکھتی آنکھیں۔ اس وقت میں کرائے کے مکان میں تھا۔ مجھ سے کہا گیا...... '' آپ اپنے یہاں 'مسلمانوں' کا آنا بند کیجئے۔ زور زور سے ملنے والوں کو سلام کرنا اور 'خدا حافظ' کہنا بند کیجئے۔''

اس حالت میں طے ہے، حالات سازگار نہیں تھے۔ صورت حال بگڑنا شروع ہوگئی تھی۔ میں نے خود اس بگڑتی حالت کو لے کر 'مسلمان' اور 'بیان' لکھا۔

مسلمان شک کے دائرے میں تھے اور کہنا چاہئے، ان بارہ تیرہ برسوں میں یہ 'دائرے' کچھ زیادہ ہی سخت ہونے لگے۔ مسلمانوں نے ڈرنا شروع کر دیا تھا۔ اردو تخلیق کاروں نے ڈرنا شروع کر دیا تھا...... اور ان سب سے زیادہ تکلیف دہ حقیقت یہ تھی کہ اردو کہانیوں نے ڈرنا شروع کر دیا تھا۔

''لڑکے کی مٹھی کا نشانہ اسی کی طرف تھا۔ آخری لمحوں میں دوڑتے ہوئے اس نے سوچا کہ بڑھ کر لڑکے کا

ہاتھ تھام لے۔ رحم کی بھیک مانگے۔ اس کو بتلائے کہ اس کا تعلق مخالف جماعت سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق کسی شے سے نہیں ہے۔ سوائے سانسوں کے..... لیکن اس کا موقع نکل چکا ہے۔ بس سے اس کے پرنچے اڑنے والے تھے۔''

('کنہ'۔ شوکت حیات)

''..... انھوں نے سنتوش کی سانس لی کہ اب وہ بستی سے دور ایسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں نہ کوئی آدمی تھا، نہ آدم زاد، وہ تینوں نئی پرانی قبروں کے درمیان بغیر کسی خوف کے قبرستان کے گھنے درختوں اور خود اگنے والی جھاڑیوں کے گہرے اندھیرے میں بڑھتے چلے گئے۔''

('پناہ'۔ ساجد رشید)

''اب دور نکل آئے ہیں۔ بتاؤ تو سہی۔ کیا بات تھی؟'' سرفراز نے گاڑی روک دی۔ ''باغ کی میڑ پر درختوں کے درمیان ایک آدمی جھکا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تھا جسے وہ زمین پر ٹکائے ہوئے تھا۔''
('آدمی'۔ سید محمد اشرف)

حقیقت میں یہی ڈرا سہا چہرہ اردو فکشن کا نصیب بن گیا۔ ناول کی بات کیجئے تو ان دنوں ہندوستان میں لکھے جانے والے تمام تر ناولوں کا ہیرو خوف تھا۔ کل عرصہ بارہ سے پندرہ برسوں کا ہے۔
موضوع: رتھ سنسکرتی سے لے کر ورلڈ ٹریڈ ٹاور منہدم کرنے کا واقعہ بھی ہے۔
مشہور ناول نگار شفق نے مسلمانوں پر منڈلاتے سیاہ بادلوں سے گھبرا کر 'بادل' لکھ دیا: ''تیسرا پلین پنٹاگن کے فوجی ہیڈ کوارٹر سے ٹکرایا ہے۔ آگ پھیلتی جارہی ہے۔ خیال ہے کہ وہ پلین وہائٹ ہاؤس سے ٹکرانے جارہا تھا۔ یہ سب کیا ہورہا ہے، خالد نے بھاری دل سے سوچا، مسلمان خوشیاں مناتے ہوئے اپنی تصویریں کیوں کھنچوا رہے ہیں۔ انھیں حادثے کے ساتھ کیوں دکھایا جارہا ہے۔ نام لئے بغیر بھی یہ سمجھایا جارہا ہے کہ اس حادثے کے ذمہ دار مسلمان ہیں۔ اگر وہ حادثے کے ذمہ دار نہیں بھی ہیں، تب بھی وہ اتنے 'سیڈسٹ' ہیں کہ اس بڑے حادثے پر دکھ کے بجائے ناچ گا کر خوشی کا اظہار کررہے ہیں۔''

('بادل')

احمد صغیر نے 'جنگ جاری ہے'، کوثر مظہری نے 'آنکھ جو سوچتی ہے'، محمد علیم نے 'جو اماں ملی' اور 'میرے نالوں کی گمشدہ آواز' میں مسلمانوں کا مرثیہ لکھ ڈالا۔ حسین الحق 'گجرات کا استعارہ' لکھ رہے ہیں۔
''نہیں! بچہ زندہ ہے۔''

ایک ڈری سہمی امید کی کرن۔ شموئل احمد ہلاکت سے دکھی ہوکر، دکھ کے افسانے کا حال بیان کر رہے ہیں۔ عبدالصمد کی 'دو گز زمین'، 'مہاساگر' اور 'خوابوں کا سویرا' میں بھی درد سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھ گیا ہے۔ سید احمد قادری، نورالحسنین، فخر الدین عارفی، مشتاق احمد نوری، مقدر حمید، سلام بن رزاق، قاسم خورشید تک اسی بے زبان درد کے شکار ہیں۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھنے والے پروفیسر جابر حسین کی کہانی اور ڈائری میں ان دنوں بس اسی درد کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جابر صاحب کا پہلا مجموعہ 'بہار کا آنکھوں دیکھا حال' تھا تو حالیہ 'ریت پر خیمہ' آج کے مسلمانوں کی ڈائری۔ وہی ڈرے سہمے سوال:

''ہماری رپورٹ کہتی ہے، گاؤں پر دوبارہ حملہ ہوسکتا ہے۔ پولیس کے دستے یہاں تعینات رہیں گے۔ لیکن سورج غروب ہونے سے قبل آپ لوگوں کو گاؤں سے چلے جانا ہوگا۔

'نہیں گئے تو......'

'نہیں گئے تو تم لوگ کیا کرلو گے۔ وہی نا، جو دنگائیوں نے کیا ہے۔ اپنی سنگینیں ہمارے سینوں میں اتار دو گے۔ یہی کرو گے نا، بولو؟''

(''بندے سے بچھوناہی'' ۔ جابر حسین)

زیب اختر، صغیر رحمانی اور شین حیات کی کہانیوں کا منظر نامہ بھی یہی ہے۔ خالد جاوید 'کوبڑا اور ہذیان' میں 'نئی علامتوں اور استعاروں' کے ذریعے اسی دکھ یا بُرے موسم کا حال کہتے نظر آتے ہیں۔ بیگ احساس کی زیادہ کہانیوں میں آج کے مسلمانوں کا درد جھانکتا ہے۔ بیگ احساس کی زیادہ تر کہانیاں ایسی دردمندی کی کہانیاں ہیں جن کے مطالعہ سے آج کے خطرناک ماحول میں سانس لیتے ہوئے مسلمانوں کا المیہ صاف طور پر نظر آجاتا ہے۔

علی امام نقوی کشمیر کو موضوع بنا کر ''بساط'' جیسا ناول لکھتے ہوں یا سلام بن رزاق ''شکستہ بتوں کے درمیان'' یا ''شہرِ گریہ'' جیسا افسانہ تحریر کرتے ہوں، سب جگہ یہی سہمے سہمے مسلمان آپ کے کردار ہیں۔ مظلوم، وقت کے ستائے ہوئے۔ 'دنگا سنسکرتی' اور گودھرا سے زخمی۔ ''انسل پلازا'' جیسے واقعے میں اپنے 'بے جرم' چہرے کو پڑھتے ہوئے۔ سچ بولنے والے، کرشن چندر جیسے لوگوں کی گنتی گنتے ہوئے۔ برکھادت اور راج دیپ سردیسائی کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے...... اسٹار پلس اور میڈیا کے کندھے سے خوش۔ اپنی 'موت' کچھ دن اور ٹالتے ہوئے۔ سہیل وحید، مظہر الزماں خاں، معین الدین جینابڑے یا پھر انور قمر کی کہانی 'گردش زد' کا 'پراسرار' خطرناک ماحول دیکھ لیجئے...... آہستہ سُر میں کہنے والے طارق چھتاری جب 'باغ کا دروازہ' لکھتے ہیں، اس وقت بھی یہی ڈر ان کی کہانی کا 'محور' بن جاتا ہے۔

'رکھوالی کا یہ طریقہ کون سا ہے؟'

'باغ کے دروازہ کھولنے ہوں گے'

لیکن باغ کے دروازہ کھلنے میں جو پریشانیاں ہیں وہ اچانک 'صدمے' کی طرح گھیر کر کھڑی ہوجاتی ہیں۔

ممکن ہے، پھر سے یہ باغ، گلستاں بن جائے......

مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ باغ پھر نہیں اجڑے گا۔"

طارق کی یہی گھبراہٹ دراصل آنے والے کل کی گھبراہٹ بن گئی ہے۔ 'مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ باغ پھر نہیں اجڑے گا۔' مسلمان تخلیق کار، کہانیاں لکھتے ہوئے انہی سوالوں کی زد میں آ گئے ہیں۔

ممکن ہے، سارا ملک گجرات بن جائے......

ممکن ہے، تو گڑیا جیسا سوچنے والے، جماعت در جماعت بڑھتے چلے جائیں......

ممکن ہے، ملک میں اکیلی پارٹی بی جے پی آ جائے......

ممکن ہے، مسلمانوں کو سنگھل، ٹھاکرے اور تو گڑیا جیسوں کے سائے میں اپنا مستقبل لکھنا پڑے......

ممکن ہے، نماز وغیرہ پر پابندی لگ جائے......

ممکن ہے، مسجدیں توڑ دی جائیں......

ممکن ہے، بھیانک بڑھتی ہوئی آگ میں 'مذہب تبدیلی' کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہو۔ ان سوالات پر 'دانش وری' کو ہوا مت دیجئے۔ بلا ناغہ اخبار دکھ لیجئے۔ ان خبروں کو سنتا پڑھتا تخلیق کار روز مرنے پر مجبور ہے۔ اس لئے کہ 'باغ' کو بچانے کی ضمانت اب کوئی لے نہیں سکتا۔ چابیاں کن کے ہاتھوں میں ہیں، سب جانتے ہیں۔

تخلیق کار ڈر گیا ہے۔

اس سے زیادہ تخلیق کار کی کہانی ڈر گئی ہے۔

اردو کہانی سے اس ڈر کا خاتمہ آپ کیسے کریں گے؟

۲۰۰۴ کے بعد کا منظر نامہ

اس میں شک نہیں کہ اردو کا سیاست سے بڑا عجیب رشتہ رہا ہے۔ شاید اسی لئے تقسیم کے وقت اردو بھی تقسیم کے لئے قصوروار ٹھہرائی گئی۔ ۲۰۰۴ انتخاب کے بعد کانگریس کی واپسی نے ایک نئی اور سنہری تاریخ کا اضافہ تو کیا ہے لیکن مسلمانوں کے لئے اب ایک دوسرا مسئلہ درپیش ہے...... یعنی کانگریس کے بعد......؟ بھاجپا کے نئے خونی راگ اپنے نفسیاتی حملوں سے بار بار ہمیں کمزور کرنے میں لگے ہیں۔ فساد اور گجرات کی کہانیوں سے اردو قلم کا باہر نکلنے کی تیاریاں تو کر رہا ہے مگر ایسا لگتا نہیں کہ مستقبل کے اندیشے اسے اس دھند سے پوری طرح نکلنے میں کامیاب کریں گے۔ اردو کا قلم کار مختلف موضوعات کی دشا میں بھٹک تو رہا ہے مگر یہ بھی دیکھنا ہے کہ قلم کار ہی کتنے بچے ہیں۔ ایک بھیانک صداقت اور ہے ...... اردو میں لکھنے والی ہندوؤں کی نسل اب پرانی پڑ چکی ہے۔ جوگندر پال، رتن سنگھ، آنند لہر جیسے نام کافی پرانے ہو چکے۔

اب ان کے بعد والی نسل اردو نہیں جانتی۔ کہتے ہیں زبان کسی مذہب، کسی قوم کی جاگیر نہیں ہوتی۔ لیکن اردو کے ساتھ تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ مسلمان ہی اپنے بچوں کو اردو پڑھاتے ہیں اور ان میں سے ہی کچھ بچے ادب کے بحرِ ذخار میں کود پڑتے ہیں۔ اب مسلمان بھی نہیں پڑھتے۔ اس لئے خوش فہمیاں بھی آہستہ آہستہ نہ ختم ہونے والی دھند میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔

اردو فکشن کا نیا منظرنامہ تاریکی میں ڈوبا ہے۔ فکر غائب...... کمزور کہانیاں۔ کمزور بُنت۔ ناول لکھے تو جا رہے ہیں لیکن انتہائی غیر معیاری۔ جن پر گفتگو کرنا تضیع اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لیکن امید کا رشتہ ابھی ٹوٹا نہیں ہے۔ عبدالصمد، سلام بن رزاق، علی امام نقوی، معین الدین جینابڑے، بیگ احساس، خالد جاوید، شوکت حیات، جابر حسین، غزال ضیغم، سہیل وحید، صغیر رحمانی، سید محمد اشرف، شموئل احمد...... یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم نے بڑی امیدیں لگا رکھی ہیں۔ کاش اشرف پھر سے ''ڈار سے بچھڑے'' اور ''لکڑبگھا' سیریز جیسی کہانیاں لکھنے لگیں۔ عبدالصمد سے ایک بار پھر ''دو گز زمین'' جیسے ناول کی امید ہے اور یقیناً یہ امید پوری ہوگی۔ سلام بن رزاق اور علی امام نقوی کی کہانیوں نے ہندی والوں کو بھی متوجہ کیا ہے۔

لیکن ایک سوال جو اپنی جگہ قائم ہے، وہ ہے کہ ان کے بعد......؟

اردو فکشن کو اب خوش فہمیوں کے جنگل سے باہر نکلنے کی ضرورت ہے......!

☆☆☆